ایکوفرینڈلی

محمد شبیر پٹیل

حبیبیہ کالونی، گاڑے گاؤں روڈ، دیگلور ناکہ، ناندیڑ، مہاراشٹر، موبائل:9960169862

جب سے ہم اپنے نئے مکان میں آئے ہیں ہم اور ہمارے بچّے ایکوفرینڈلی (Eco Friendly) ہوگئے ہیں۔ نیا مکان کافی وسیع ہے۔ تین کمرے، دالان، باورچی خانہ اور دیوان خانہ کے علاوہ کشادہ صحن بھی ہے۔ جہاں مختلف قسم کے درخت اور پھول کے پودے لگائے گئے ہیں۔ تھوڑی بہت کچن گاڈننگ بھی ہوجاتی ہے۔ چند بڑے درخت بھی ہیں۔ موگرا، چنبیلی اور رات کی رانی تو خاص اہتمام سے لگائی گئی ہیں۔ چنبیلی کی بیل بڑی ہوکر منڈوے پہ چڑھ چکی ہے۔ صبح فجر کے بعد ہم شاہجہاں کے انداز میں اپنے چوبی تخت پر دوزانو بیٹھے پھول سونگھ رہے تھے کہ بیگم نے فقرہ کس دیا کہ ''بس مونچھ کی کمی ہے۔'' کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ دوپہر کے وقت ہم چنبیلی کے منڈوے تلے ابھی لیٹے ہی تھے کہ کہیں دور سے مخدوم کی نظم:

'دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے اک چنبیلی کے منڈوے تلے'

بج اٹھتی ہے۔ اس وقت بیگم خاص طور پر باورچی خانہ کی کھڑکی سے جھانکتی ہیں اور ہمیں اکیلا جلتا دیکھ مطمئن ہوکر اپنے کام میں لگ جاتی ہیں۔ ہم آج تک یہ بات نہیں سمجھ پائے کہ مخدوم محی الدّین نے یہ ساری منظر نگاری 'میکدے سے ذرا دور اس موڑ پر' ہی کیوں کی ہے۔ میکدے کے قریب بھی منظر نگاری کی جاسکتی تھی؟

پیڑ پودوں سے ہماری محبت بہت مشہور ہوگئی ہے اور یہ سستی شہرت ہمیں بہت مہنگی پڑ رہی ہے کیونکہ ہمارے ایک موکّل نے ہمیں فیس کے بدلے دو ناریل کے چھوٹے درخت دیے ہیں۔ ہمارے استفسار پر انھوں نے کہا ''یہ محض آپ کے ذوق کی تسکین کی خاطر دے رہا ہوں۔ آپ کا ذوق بھی پورا ہوجائے گا۔ آپ پیڑ لگائیے ناریل آپ کے پوتے کھائیں گے۔ سنا ہے کہ آج کل آپ بہت ایکوفرینڈلی یعنی 'ماحولیات دوست' ہوگئے ہیں۔ گھر کے سارے ممبران کے ایکوفرینڈلی ہوجانے کی وجہ سے گھر کا ماحول ہی کچھ بدل گیا ہے۔ درختوں اور منڈوے پر جگہ جگہ پرندوں کے لیے مٹی کے چھوٹے برتنوں میں دانہ پانی کا نتظام کیا گیا ہے اور مکان کے ولتن سے چڑیوں کے لیے رہائش کا انتظام کچھ یوں کیا گیا ہے کہ جوتے وسینڈلوں کے خالی کارٹونوں کو کاٹ کر اُن میں محرابیں بنائی گئی ہیں اور چڑیوں اور بلبلوں نے باضابطہ وہاں رہائش اختیار کر رکھی ہے۔ یہ دیکھ کر گھر کے سارے افراد بہت خوش ہیں۔ بیگم نے تو اسے کارِ خیر سمجھ کر دل میں یہ نیت بھی کرلی ہے کہ اس کا ایصالِ ثواب مرحومین کو پہنچے۔ بچّوں نے انتہا پسندی کے سارے کھیل ترک کر دیے ہیں۔ غلیل چلانا بند کردیا ہے۔ اب بچّے پھندہ لگا کر گرگٹ کو نہیں پکڑتے ورنہ پہلے یہ ہوتا تھا کہ جہاں کہیں بھی درخت پر گرگٹ نظر آیا بچّے لمبی چھڑی میں پھندہ لگا کر بڑی چابک دستی سے گرگٹ کے گلے میں پہنا دیتے۔ پھر اُسے پھندے میں لٹکائے ہوئے بچّے اس کے اطراف اس طرح ناچتے جیسے افریقہ کے وحشی قبائل اپنے دشمن کو پکڑنے کے بعد ناچتے ہیں۔ بعد میں گرگٹ کو سنگ سار کردیا جاتا ہے۔ تاویل یہ کی جاتی ہے کہ گرگٹ نے سر کے اشارے سے دشمنوں کو پیغمبرؐ کا پتہ بتایا تھا، مگر جب سے بچّے ایکو فرینڈلی ہوگئے ہیں تب سے ہمارے یہاں گرگٹوں کو یہ سہولت حاصل ہوگئی ہے کہ وہ جتنے چاہے رنگ بدلیں کہ درختوں پر مکمل آزادی کے ساتھ پھریں۔ ہمارے یہاں کی گلہریاں بھی اب خاصی فربہ اندام ہوگئی ہیں کیونکہ بچّے ہمارے حصّے کے کاجو بادام انھیں کھلا دیتے ہیں۔ ہمیں مونگ پھلیوں پر ہی اکتفا کرنا پڑ رہا ہے۔

ملک میں جب سے 'یوم زمین' منایا گیا ہے تب سے ہمارے بچّے ماحولیات کے تئیں کچھ زیادہ ہی باشعور ہوگئے ہیں۔ حیاتیات اور نباتیات پر گھر میں نت نئے بحث ومباحثے ہوتے ہیں۔ ہمارا وکالت خانہ جہاں ہم بیٹھ کر گھنٹوں اپنے موکلوں کے ساتھ قانونی نکات پر غور وخوض کیا کرتے بچّوں نے اسے دفترِ ماحولیات وموسمیات میں تبدیل کردیا ہے:

رفتارِ انقلاب دیکھ
کتنا آہستہ کتنا تیز

پہلے گھر میں جب کبھی چوہوں کی بہتات ہوجایا کرتی تھی تو ان کی شامت کا انتظام بھی بہت جلد ہوجایا کرتا تھا۔ یا تو پنجرے میں پنیر لٹکا کر اُنہیں قید کیا جاتا یا پھر پنیر سے کام نہیں چلاتو زہر ڈال کر ان کا کام تمام کردیا جاتا تھا۔مگر اس میں پریشانی یہ ہوتی کہ چوہے گھر میں نامعلوم جگہ جا کر مرتے جس کی وجہ سے گھر میں تعفن کچھ ایسا پھیلتا کہ جینا اجیرن ہوجاتا،لیکن بچّوں کا رویہ اب چوہوں کے تئیں تھوڑا موڈریٹ ہوگیا ہے۔نہ جانے چوہوں کو نہانے کے صابن سے کیا رغبت ہے کہ اکثر اُسے چُرا لے جاتے ہیں۔اس بابت جب بچّے ہم سے سوال کرتے ہیں کہ بابا چوہے صابن لے جا کر کیا کرتے ہیں تو ہمارا جواب یہ ہوتا ''شاید لے جا کر نہاتے ہوں گے۔'' جب گھر میں چوہوں کی موش مستیاں کچھ زیادہ ہی بڑھ گئیں تو بچّوں کو بھی شرارت سوجھی اور وہ بھی شاید اُن کی نظر میں ایکوفرینڈلی شرارت تھی۔سنا کہ پتّے جسے ہم قبض کشا کے طور پر استعمال کرتے تھے بچّوں نے اسے چنے کے ساتھ کوٹ کر اس کی چھوٹی چھوٹی گولیاں بنائیں اور چوہوں کے بِلوں کے دہانے پر رکھ دی اور نتیجہ وہی نکلا جو بچّے چاہتے تھے۔پھر کیا تھا گھر میں چاروں طرف اس قدر چوہوں کی مینگنیاں نظر آنے لگیں کہ گھر کی ایکولوجی یعنی ماحول کا توازن بگڑ گیا۔بچّوں کی اس حرکت پر بیگم نے اُنہیں خوب ڈانٹا اور ساتھ میں یہ سزا بھی سنائی کہ گھر کی ساری صفائی اب بچّے خود کریں گے۔

چوہوں سے چھٹکارا پانے کے لئے گھر میں بلّی پالنے کا فیصلہ کیا گیا۔بڑی دوڑ دھوپ کے بعد بچّے کہیں سے ایک بلّی لانے میں کامیاب ہوگئے اور سارے بچّے بلّی کے ناز نخرے اٹھانے میں لگ گئے۔صبح شام اُسے دودھ پلایا جانے لگا اور قصائی کی دکان سے چھیچھڑے لاکر اس کی خاطر تواضع کی جانے لگی،مگر ہماری بلّی چوہوں کی طرف ذرا بھی راغب نہیں ہوتی۔چوہے شاید یہ بات بھانپ گئے تھے اس لیے وہ بلّی سے ذرا بھی نہیں ڈرتے۔کبھی تو ایسا بھی ہوا کہ بلّی سو رہی ہے اور چوہے اس کے پیٹ پر کود رہے ہیں۔کسی انصاف پسند بادشاہ کی تعریف کرنی ہو تو یوں کہتے ہیں کہ اس کی حکومت میں شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پر پانی پیتے تھے،مگر ہم نے گھر میں بارہا یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ چوہے اور بلّی ایک ہی برتن میں کھا رہے ہیں۔اس طرح سے ہمارے گھر میں 'ٹوم اور جیری' والا کھیل شروع ہوگیا۔ویسے بلّی بہت ایکوفرینڈلی ہوتی ہے۔وہ اجابت سے فارغ ہونے کے بعد اس پر مٹّی ڈالنا نہیں بھولتی۔اس کے ایکوفرینڈلی بن جانے کے پیچھے ایک کہانی بہت مشہور ہے۔کہتے ہیں کہ بلّی رشتے میں شیر کی خالہ ہوتی ہے۔ایک مرتبہ شیر نے شکار کرنے کے بعد اپنی خالہ یعنی بلّی کو گاؤں سے آگ لانے کے لیے بھیجا تھا تاکہ گوشت بھون کر کھایا جاسکے۔بلّی آگ لانے تو گئی تھی مگر اسے ایک گھر میں دودھ کی ہنڈیا مل گئی اور وہ 'آنکھیں موند کر' دودھ پینے میں ایسی مشغول ہوئی کہ شیر کے لیے آگ لے جانا بھول گئی۔شیر نے بہت دیر تک اپنی خالہ کا انتظار کیا مگر وہ نہیں آئی تو مجبوراً اسے کچّا ہی گوشت کھانا پڑا۔جب شیر کھانے سے فارغ ہو چکا تو بلّی آگ لے کر آئی۔شیر نے غصّے سے کہا کہ یہاں سے چلی جا میں تیری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔اس پر بلّی نے کہا کہ ارے جا! تو میری صورت تو کیا میری 'اجابت' بھی نہیں دیکھ سکے گا۔کہتے ہیں تبھی سے بلّی اجابت کے بعد بڑے اہتمام سے اسے مٹّی سے چھپا دیتی ہے۔

رسوئی گیس،مٹّی کے تیل کی قِلت دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے۔گیس ایجنسی والے گیس سلینڈر اور کیروسین بلیک سے اونچے دام میں مارکیٹ میں بیچ دیتے ہیں۔غریبوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے مگر متوسط طبقے کے لوگوں کو بھی پریشانی کا سامنا ہے۔جلانے کو گیس تو نہیں ملتا اور ہم لکڑیاں بھی جلا نہیں سکتے کیوں کہ ہمارا گھر ایکوفرینڈلی جو ٹھہرا۔لوڈ شیڈنگ والوں نے بجلی کا حال برا کر رکھا ہے۔رات رات بھر بجلی گل رہتی ہے۔کہتے ہیں اگلے زمانے میں مٹّی کا تیل نہیں ہوتا تھا۔چراغ یا تو میٹھے تیل کے جلائے جاتے تھے یا ارنڈی کے تیل کے۔گھاس پھوس کے مکان ہوا کرتے تھے۔چونکہ چراغ میٹھے تیل سے جلائے جاتے تھے چوہے اسے کھینچ لے جاتے۔اس وجہ سے گھروں کو آگ لگ جاتی اور گاؤں کے گاؤں جل کر راکھ ہوجاتے۔اس لیے گھروں میں لوگ چراغ بجھا کر سونے لگے اور ویسے بھی رات کو چراغ بجھا کر سونے کے کئی فائدے ہیں۔گیس،کیروسین اور بجلی کی قِلت سے ہمارا گھر بھی پریشان ہے۔ایک روز بچّوں نے اس سنگین مسئلے کو حل کرنے کے لیے ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا۔سب کے سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔بہت غور وخوض کے بعد ہمارے ایک دوسرے نمبر کے فرزند نے ایک تجویز رکھی کہ 'بابا میں نے اس کا ایک حل ڈھونڈ نکالا ہے جس کے ذریعہ ہم کم سے کم خرچ میں رسوئی گیس کا انتظام کر سکتے ہیں۔نہ ہمیں کیروسین والوں کی خوشامد کرنی پڑے گی اور نہ گیس ایجنسی والوں کو بار بار فون کرنا پڑے گا۔اسکول میں میرا ایک دوست ہے۔جو دیہات کا رہنے والا ہے۔وہ بتا رہا تھا کہ اس کے گاؤں میں گھر گھر گوبر گیس کا پلانٹ

ہے۔ کیوں نہ ہم بھی اپنے گھر میں گوبر گیس کا پلانٹ لگوالیں۔ اس پر ہمارے دوسرے لڑکے نے کہا ''مگر اس کے لیے ہم گوبر کہاں سے لائیں گے؟'' تیسرے لڑکے نے کہا ''ہمیں اس پلانٹ کے لیے گوبر مل سکتا ہے مگر ہمیں روزانہ گولی پورا جا کر گوالوں سے گوبر خریدنا ہوگا۔'' اس پر بیگم نے کہا ''پہلے ہم گیس والوں کی خوش آمد کرتے تھے۔ اب گوالوں کی خوشامد کرنا پڑے گی۔ ہمارے بڑے لڑکے نے کہا ''اس سے تو بہتر یہ ہوگا کہ ہم ایک عدد بھینس خرید لیں۔ اس سے دودھ کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔'' بیگم کو یہ تجویز بہت پسند آئی۔ وہ دل ہی دل میں دودھ اور دہی کے خواب دیکھنے لگیں اور کیا پتہ اپلیاں بھی تھاپ رہی ہوں۔ بیگم ہی کیا بھینس کے ذکر پر ہمارے بھی دل پر ایک تیر سا چلا۔ بقول غالب:

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

بچپن کی یادیں تازہ ہوگئیں اور بھینس بھی یاد آ گئی جو گاؤں میں ہمارے گھر ہوا کرتی تھی اور جس کی پیٹھ پر بیٹھ کر ہم کھیت کھلیانوں میں گھوما کرتے تھے اور کئی بار تو ایسا بھی ہوا کہ اُس کی دم کو 'نا خدا' بنا کر ہم دریا بھی پار کر آئے۔ بچّوں کو لگا کہ شاید ہمیں بھینس کا مشورہ پسند نہیں آیا۔ ہم نے انہیں سمجھایا کہ بیٹا بات یہ نہیں یہاں شہر میں ہم بھینس پالیں گے تو اُس کے لیے چارا کہاں سے لائیں گے؟ ہمارے چوتھے نمبر کے لڑکے نے یہ مسئلہ بھی چٹکی میں حل کر دیا۔ کثیر العیال ہونے کا یہی ایک فائدہ ہوتا ہے کہ ہر بچّے کے پاس کوئی نہ کوئی ترکیب ہوتی ہے۔ ہمارے پوچھے جانے پر اس نے یوں کہا:

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

ہم نے کہا ''یہ تو مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی نظم کا ایک شعر ہے۔ اس سے گھر کے چولہا چوکا کا سنگین مسئلہ بھلا کیسے حل ہوگا۔'' بچّے نے کہا ''بابا یہ مولوی اسمٰعیل یہ میرٹھی کی نظم کا شعر نہیں بلکہ الہٰ دین کا چراغ ہے۔ مولوی اسمٰعیل میرٹھی بہت ہوشیار بزرگ شاعر تھے۔ اُنھوں نے اللہ میاں کا گائے بنانے پر ہی شکر ادا کیوں کیا۔

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری بھینس بنائی

اسمٰعیل میرٹھی یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ ہندوستان میں بھینس نہیں بلکہ گائے مقدّس جانور ہے۔ ہم نے بچّے کی تقریر کو سن کر کہا ''برخوردار تم گھر کے مسائل حل کر رہے ہو یا گائے پر کوئی تحقیق کر رہے ہو اور اگر ہم بھینس کے بجائے گائے پال لیں بھی تو چارے کا مسئلہ بہرحال برقرار رہے گا۔ اس پر بچّے نے کہا ''چارے کا مسئلہ حل ہو چکا بابا؟ میں وہی تو کہہ رہا ہوں۔ ہمارے محلّے سے تھوڑی ہی دور مارواڑ گلی ہے۔ میں نے کئی بار دیکھا ہے کہ وہاں عورتیں گائے کو روٹیاں اور چارا کھلا رہی ہیں۔ ہم گائے خرید کر لائیں گے اور روزانہ اُس سے دودھ اور گوبر حاصل کر لینے کے بعد اسے مارواڑ گلی میں چھوڑ آئیں گے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ہندو بھائی گائے کو بھوکا نہیں رکھیں گے۔'' بچّے کی اس تجویز پر ہم سر دھننے کے علاوہ کیا کر سکتے تھے۔ ہم بچّے کے اس ماحولیاتی نظام کے ادراک پر عش عش کرنے لگے۔ چشمِ بددور! بچّے نے کیا خوب غذائی زنجیر بنائی ہے۔ ماحولیات کی درسی کتاب ہم نے پڑھی ہے۔ اس میں غذائی زنجیر کچھ یوں بنتی ہے۔ اس کو ہرن کھاتا ہے، ہرن کو شیر کھاتا ہے اور شیر کے مر کر مٹی بننے کے بعد باریک جراثیم اسے کھاتے ہیں اور اس طرح زمین زرخیز ہوتی ہے مگر ہمارے فرزند نے جو غذائی زنجیر بنائی وہ کچھ اس طرح ہے۔ گائے سے گوبر اور دودھ ہم لے رہے ہیں، اور اس کی چارہ گری بیچارے ہندو بھائی کر رہے ہیں۔ یہ اچھی مذہبی رواداری ہوئی اور مذہبی رواداری کی ہندوستان جیسے ملک میں سخت ضرورت ہے۔ اس بچّے کے ایکو فرینڈلی یعنی ماحولیات دوستی پر ہم حیرت زدہ تھے۔ تبھی ہمارے بڑے فرزند نے شاید یہ سوچا کہ اس کا چھوٹا بھائی اِس ہنگامی اجلاس میں اس سے بازی مار رہا ہے اور ہم اس کی ذہانت پر سر دھن رہے ہیں۔ تو اِسے اپنے چھوٹے بھائی پر رشک ہونے لگا۔ ایک بھائی کا دوسرے بھائی پر رشک کرنا اولادِ آدم کی پرانی عادت ہے۔ ورنہ جھگڑا کیوں ہوتا۔ اُس نے کہا ''بابا مجھے بھی اسمٰعیل میرٹھی کی زمین میں ایک شعر یاد آ رہا ہے، مگر یہ شعر جناب چرکین کا ہے۔ جن کے نام پر ہم محتاط ہو گئے اور ہم نے کہا ''بیٹا اگر حدِ ادب کا کوئی شعر ہو تو سناؤ ورنہ رہنے دو کیوں کہ تمھیں نہیں معلوم چرکین محفل میں شعر سنانے سے قبل جوتیاں بغل میں رکھتے تھے۔ اِدھر شعر کہا اُدھر فرار۔ کیوں کہ ان کا ہر شعر ادب سے باہر کا ہوتا تھا۔ بچّے نے کہا ''ادب کا شعر ہے اور آج کے ہنگامی اجلاس سے منسلک ہے۔ ہمارے اجازت دینے پر اس نے عرض کیا:

کیا خدا کی خدائی ہے
جس نے جگنو پہ لائٹ لگائی ہے

پھر ایک بار ہماری سر دھننے کی باری تھی۔ بچّے نے یہ شعر سنا کر جیسے بجلی کے لوڈ شیڈنگ کا مسئلہ ہی حل کر ڈالا ہو۔ پھر اس لڑکے نے بیّا

چڑیوں کے گھونسلے کی بابت بھی ہمیں بتایا کہ کس طرح وہ اپنے گھونسلوں میں جگنوؤں کو مٹی کے ڈھیلوں میں چھپا کر گھونسلے کو روشن کرتی ہے۔ اس پر ہم نے کہا ''تو کیا تم بجلی جانے کے بعد گھر میں روشنی کا انتظام جگنوؤں کے ذریعہ کرنا چاہتے ہو؟ گویا جگنو نہ ہوقندیل ہو، مگر تم اتنے جگنو لاؤ گے کہاں سے؟'' اس نے کہا ''Ecosystem یعنی ماحولیاتی نظام کی یہی تو ایک خاص بات ہوتی ہے کہ اس کی زنجیر کی ایک کڑی دوسری کڑی سے ملی ہوئی ہوتی ہے۔ شاید آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ جگنو گوبر میں ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اس طرح اس ہنگامی اجلاس میں ہم نے اور ہمارے بچّوں نے مل کر بجلی، رسوئی گیس اور دودھ کے سنگین مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی۔

بچّوں نے ایک نشست یوم زمین کے موقع پر 'یوم اشجار' کے نام سے منعقد کی۔ ان کے کچھ ہونہار دوست بھی آئے ہوئے تھے۔ شاید جو بچّوں کی ایکو فرینڈلی تنظیم کے رکن بن چکے تھے۔ ویسے بھی ہمارے بچّوں کی یہ تنظیم کافی مشہور و مقبول ہو چکی ہے اور اس کے ممبران کی تعداد دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔ جس کی وجہ سے ہمارا دفتر تنگ دامانی کا گلہ کر رہا ہے۔ اگر کسی بچّے کو اس تنظیم کا رکن بننا ہو تو اس کو کچھ شرائط پورے کرنے ہوتے ہیں۔ مثلاً اسے اپنے گھر میں ایک درخت لگانا ہوتا ہے اور اسے یہ عہد بھی کرنا ہوتا ہے کہ چرند و پرند کو ہراساں نہیں کرے گا۔ تیر، غلیل نہیں چلائے گا۔ چونکہ ہم اس تنظیم کے فاؤنڈر ممبر تھے اس لیے بچّوں کے دلوں میں درخت و پیڑ پودوں کے تئیں محبت پیدا کرنے کی خاطر ہمیں ہی تقریر کرنی پڑتی تھی۔ آج کا موضوع چونکہ 'یوم اشجار' تھا اس لحاظ سے ہم نے بچّوں کے آگے جو تقریر کی وہ کچھ یوں تھی۔

پیارے بچّو! اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ شجر، حجر، چرند پرند سب اس کی تسبیح کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ درختوں سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ آپ اس بات سے بخوبی لگا سکتے ہیں کہ جنت میں جگہ جگہ درخت اور باغ ہیں۔ ایک شجر تو ایسا بھی ہے جو شجر ممنوعہ ہے۔ اس کے قریب جانے سے اور اس کا پھل کھانے سے آدمؑ اور حوّا کو منع کیا گیا تھا، مگر شیطان کے بہکانے پر آدمؑ اور حوا نے اس کا پھل کھا لیا۔ اس کا فوراً ردِّعمل یہ ہوا کہ جنت کا لباس ان کے بدن سے اُتر گیا۔ دونوں شرم کے مارے درخت کے پتّے توڑ توڑ کر اپنے جسم کو ڈھانپنے لگے۔ اللہ تعالیٰ کو جلال آ گیا اور آدمؑ اور حوّا جنت سے نکال دیے گئے۔ اگر یہ دونوں جنت سے نکالے نہ گئے ہوتے تو ہم انسانوں کی آبادی جنت میں ہی ہوتی۔ اگر انسانوں کو دوبارہ جنت میں جانا ہو تو اچھے اعمال کرنے ہوں گے اور خاص کر پیڑ پودوں کو تو قطعی کوئی نقصان نہیں پہنچانا ہوگا، لیکن ہم کرتے کیا ہیں آئے دن پیڑ پودوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ کو غصّہ نہیں آتا ہوگا۔ پھر ہم نے بچّوں کو رسول اللہ ﷺ کی وہ حدیث بھی سنائی جس میں آپ ﷺ نے قبر پر پودے لگائے تھے۔ چونکہ پودے اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ پودے لگانے سے صاحبِ قبر کے عذاب میں کمی واقع ہوتی ہے۔ ہماری اس تقریر نے بچّوں پر جادوئی اثر کیا اور سب بچّوں نے درختوں کو نقصان نہ پہنچانے کا پکّا عہد کیا۔ ہم دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے اور اپنی 'سحر البیان' تقریر پر اپنی پیٹھ آپ ہی تھپتھپا رہے تھے۔

نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

اس محفل میں ایک لڑکا ایسا بھی تھا جو بہت غور سے ہماری تقریر سن رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر ہم سے ایک سوال پوچھنے کی اجازت چاہی۔ اس نے کہا ''انکل کیا پرندوں کا شکار جائز ہے۔'' ہم چونک گئے۔ آج کا موضوع تو شجر ہے، لیکن شکاریات پر ہم سے سوالات کیوں پوچھے جا رہے ہیں۔ ہم نے دل ہی دل میں کہا ان بچّوں کے بیچ تقریر کرنی ہو تو کیا شکاریات پر بھی ہمیں معلومات رکھنی ہوں گی۔ ہم نے کہا ''بچّو! کچھ حلال چرند پرند کا شکار ہمیں بقدر ضرورت جائز ہے مگر تمھیں پرندوں کے شکار کی ضرورت کیوں آن پڑی۔ کیا تمھارے گھر میں مرغیاں اور بطخ نہیں پالی جاتیں؟ اس لڑکے نے کہا ''انکل بات یہ ہے کہ ہمارے گھر میں ایک 'ایئر گن' ہے۔ کل میں نے اس ایئر گن سے ایک کبوتر کو مار گرایا۔ ہم نے کہا ''برخوردار تم نے بہت ہی برا کام کیا ہے۔ کیا تم جانتے ہو کچھ پرندے جوڑے بنا کر رہتے ہیں۔ ایک نر اور ایک مادہ ہوتا ہے۔ ان کا گھونسلہ ہوتا ہے۔ اس میں بچّے ہوتے ہیں۔ تم نے جس کبوتر کو مارا پتہ نہیں وہ نر تھا یا مادہ۔ اب گھونسلے میں اس کا ساتھی اس کے بچّے اس کی راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ جواب کبھی گھر لوٹ کر نہیں آئے گا۔ تم نے ایک خاندان کو برباد کر ڈالا۔ ہمارا اِتنا تھا کہ وہ لڑکا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور سارا ماحول غمگین ہو گیا۔ رونے کی آواز سن کر بیگم بھی دفتر میں آ دھمکیں اور اس لڑکے کو روتا دیکھ کر اسے سمجھانے لگیں اور ہمیں ڈانٹا کہ ''یہ کیا حرکت ہے آپ بچّوں کو کیوں رُلا رہے ہیں۔ ہم نے یہ اجلاس ختم کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ دوسرے دن اس امیر زادے نے اپنی ایئر گن ہمارے دفتر لا کر جمع کرا دی۔ ہم نے اس گن کو صیغۂ ضبطی میں بھجوا دیا۔ جہاں بچّوں نے تیر کمان، لکڑیاں اور غلیلیں جمع کر رکھی تھیں اور بچّوں نے جن کے استعمال کو ممنوع قرار دیا

تھا۔اس میں اب ایئر گن کا بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ بچّہ باضابطہ ہماری تنظیم کا رکن بن گیا۔اس نے یہ عہد بھی کیا کہ جنگلی کبوتروں کو رہنے کے لیے وہ ایک کبوتر خانہ بھی بنائے گا۔

شجرالحیا: جب سے آنگن میں درخت اور دیگر اقسام کے پودے لگائے گئے ہیں تب سے ہمارے ہاں طوطا' مینا موسمِ بہار میں کوئل کی کوک سنائی دینے لگی ہے۔ ورنہ پہلے صرف باورچی خانے سے کوکر کی سیٹیاں ہی سنائی دیتی تھیں۔ ہمارے گھر کے باورچی خانے کی خاص بات یہ ہے کہ صرف چائے کے اوقات پر ہی وہاں ٹھسکے نہیں ہوتے۔ وہ بھی اس لیے کہ چائے کو بگھارنے کا رواج نہیں ہے۔ ورنہ بیگم کا بس چلے تو وہ چائے کو بھی بگھار کر بنائیں۔ باورچی خانے کی دوسری اشیا میں ٹماٹر اور ہرا دھنیا لازم وملزوم ہیں۔ ہرے دھنیے کو کچھ لوگ کوتھمیر بھی کہتے ہیں۔ پتہ نہیں یہ کہاں کا میر ہے؟ ہم باورچی خانے کو خاص طور پر بیگم چی خانہ کہتے ہیں۔ کیونکہ محترمہ کو لفظ باورچی پر اعتراض ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ ''کیا میں باورچن ہوں''؟ ہمیں بھی ایسے فضول لفظ سے کوئی دلچسپی نہیں جس سے گھر میں خانہ جن کی کا امکان رہے۔ لہٰذا ہمارے بیگم چی خانے کی لازم وملزوم اشیا یعنی کوتھمیر اور ٹماٹر کی پیداوار پر ہم کچن گارڈننگ میں خاص طور پر توجہ دیتے ہیں۔

ایک مرتبہ بچّوں کی محفل میں ہم نے اپنی تقریر میں ایک پودا 'لاجونتی' جسے عربی میں 'شجرالحیا' کہتے ہیں، کسی ماہر نباتات کی طرح اس پودے پر لیکچر جھاڑ دیا تھا۔اس تقریر کا محرک ہمارا ایک موکل ہوا تھا۔ جو کہ ایک ڈاکٹر تھا۔ان ڈاکٹر صاحب نے اپنے دواخانے میں سونوگرافی کی مشین رحم مادر میں جنس کی تشخیص کی غرض سے نصب کی تھی، مگر محکمۂ پولیس کو پتہ چل گیا اور پولیس نے ڈاکٹر صاحب کے دواخانے کو سیل کر دیا اور ان پر قانونی کارروائی بھی ہوئی۔ چونکہ یہ کیس ہم لڑ رہے تھے اور ڈاکٹر صاحب سے یہ کیس ہم نے اس شرط پر لیا تھا کہ وہ آئندہ اس غلطی کا اعادہ نہیں کریں گے۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب کو بچّوں کے سامنے کھری کھوٹی بھی سنائی۔ مزید ایک شرط ان کے سامنے یہ بھی رکھی کہ ان کو بچّوں کی تنظیم 'ایکو فرینڈلی' کا ممبر بننا ہوگا۔ ہمارے بچّے درختوں کے پتے بھی توڑنا گناہ سمجھتے ہیں اور یہ ڈاکٹر صاحب ہیں کہ ماں کے رحم میں بچّوں کی جنس کا پتہ لگانے کی مشین اپنے مطب میں لگانے کے فراق میں تھے۔ اس مشین کے ذریعہ گر یہ پتہ چل جائے کہ رحم مادر میں لڑکی ہے تو اسے ضائع کر دیا جاتا ہے۔ یہ ایک بڑا گناہ تو ہے ہی اور قانونی طور پر گھناؤنا جرم بھی۔ڈاکٹر صاحب کا کہنا یہ تھا کہ ابھی انھوں نے سونوگرافی کی صرف مشین لگائی تھی۔اس کا استعمال نہیں کیا تھا۔ یہ اچھا ہوا ورنہ ڈاکٹر صاحب کی مشین چالو ہوجاتی اور وہ ماں کے رحم میں لڑکیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ٹھکانے لگاتے۔ تو اقبال کے اس مصرعہ:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

کا کیا حشر ہوتا۔ پوری کائنات پھیکی ہوجاتی۔اس موقع پر بچّوں نے غالب کا یہ شعر بھی یاد دلایا:

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

ڈاکٹر صاحب کے جانے کے بعد ہم نے بچّوں کے آگے اس پودے کا ذکر بھی کیا تھا، جس کے متعلق ہم نے جڑی بوٹیوں کی کتاب میں ایک مضمون پڑھا تھا جسے 'شجرالحیا' کہا جاتا ہے۔اس پودے کی خاص بات یہ ہے کہ یہ صرف مرد کے چھونے سے اپنے پتے سیکڑ لیتا ہے۔ کسی خاتون کے چھونے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔اس کتاب کے مصنّف کا دعویٰ تھا کہ اس پودے سے ہم سونوگرافی مشین کا کام لے سکتے ہیں۔اگر کسی حاملہ عورت کے رحم میں اولادِ نرینہ ہو اور وہ اس پودے کو چھولے تو وہ اپنے پتے سیکڑ لے گا۔اور اگر لڑکی ہو تو اس پودے پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔اب بچّے اس پودے کو اپنے گھر میں لگانے کی ضد کرنے لگے مگر ہمارے یہاں کوئی نئی چیز لانے سے پہلے بیگم صاحبہ سے پیشگی اجازت لینا ضروری ہوتا ہے۔اس میں پریشانی یہ ہوئی کہ شاید بیگم اس شعر کے معنیٰ بھانپ گئیں:

ہوگئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں
اس لیے خاک سے ہوتے ہیں گلستاں پیدا

اس لیے وہ کسی نئے پیڑ پودوں کو لگانے کی اجازت نہیں دینا چاہ رہی تھیں۔ یہ شجرالحیا تو بڑا جادوئی اور مردشناس پودا تھا، جو صرف مرد کے چھونے سے پتے سیکڑ لیتا ہے۔ہم نے بیگم کو بہتیرا سمجھایا کہ یہ پودا لگانے سے ہمارے عادات واطوار میں کوئی فرق نہیں آئے گا اور آپ تو جانتی ہیں کہ ہم بذاتِ خود شجرالحیا قسم کے آدمی ہیں۔ بیگم نے ان شرطوں پر شجرالحیا کا پودا گملے میں لگانے کی اجازت دی کہ ہم اس پودے کو نہیں چھوئیں گے اور نہ ہی کوئی پرائی حاملہ عورت اس پودے کو ہاتھ لگائے گی۔ نرسری سے شجرالحیا کا پودا لاکر گملے میں لگا دیا گیا۔تھوڑے ہی دنوں میں یہ پودا بڑا ہوگیا تو بچّوں نے اس پر تجربہ شروع کر دیا۔ وہ مرغیوں کے انڈوں کو اس پودے سے لگا کر یہ دیکھتے ہیں کہ آیا اس میں مرغ ہے یا مرغی؟

○○